سید صاحب کی زندگی کے وہ خاص گوشے

جن سے میں متاثر ہوا

از

(عتیق الرحمٰن عثمانی)

لکھنؤ کے ایک یادگار تاریخی اجتماع میں جو مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ کے سانحۂ وفات پر اظہارِ غم کے لئے ۲۶ ر ۲۷ ر دسمبر ۵۳ء کو ندوۃ العلماء کے لائبریری ہال میں منعقد ہوا تھا، قلتِ وقت اور بے فرصتی کی وجہ سے اس کے لئے کوئی مقالہ تیار نہیں ہو سکا تھا تاہم اس باکمال شخصیت کے حادثۂ ارتحال کے طبعی اثر اور اجتماع کے داعیِ خاص مولانا سید ابوالحسن علی کے ارشاد کی تعمیل میں شرکت کی سعادت میسر ہوئی اور غیر ارادی طور پر ایک ایسے عنوان پر کچھ کہنے کا موقع مل گیا جس کی عام حالات میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہو سکتی تھی

چونکہ یہ علمی اجتماع جس میں مقامی اور غیر مقامی اہلِ علم وفضل اور اربابِ کمال کی بہت بڑی تعداد شامل تھی سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی علمی خدمات کی یاد ہی تازہ کرنے کے لئے انعقاد پذیر ہوا تھا اس لئے قدرتی طور موضوعِ سخن مرحوم کے کمالات وخصائل ہی ہو سکتے تھے، چنانچہ دو روزہ کے اس اجتماع میں جس کو اپنی سنجیدگی، سادگی خلوص، اثر پذیری اور عظمت کے لحاظ سے ایک بے مثال اجتماع کہا جا سکتا ہے، سید صاحب کی علمی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خوب خوب مقالے پڑھے گئے، اور سادہ، سادہ اچھے اچھی تقریریں ہوئیں۔

میری تقریر کی اطلاع مولانا سعید احمد صاحب ایڈیٹر "برہان" کو ہوئی تو انھوں نے مجھ سے دریافت کئے بغیر "برہان" کے "نظرات" میں اس کی اشاعت کا اعلان کر دیا حالانکہ

اس وقت تک نہ تو یہ تقریر قلم بند ہو سکی تھی اور نہ اس کو "برہان" میں شایع کرنے کا خیال تھا البتہ مولانا ابوالحسن علی دام فضلہم نے اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے اصرار فرمایا تھا اور وہ اس کو "معارف" کی اشاعتِ خاص میں دینا چاہتے تھے،

مولانا سعید احمد میرے مزاج کی افتاد کے سب سے بڑے رمز شناس واقع ہوئے ہیں اس لئے انھوں نے دباؤ ڈالنے کا غالباً یہی انداز پسند کیا اور اس طرح بدرجۂ مجبوری تقریر کے بعض اجزا قلم بند کرنے پڑے، مجھے احساس ہے کہ "برہان" میں اس کی اشاعت مولانا علی میاں کی اجازت کے بغیر نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن اس کا بھی موقع نہیں مل سکا اور اب موصوف سے معذرت کے ساتھ تقریر کے بعض حصّے پیش کئے جا رہے ہیں جو معاصر عزیز "نشانِ منزل" بقول ب کے بیان کے مطابق "الفاظ کے لحاظ سے اگرچہ مختصر ہے مگر معنی کے لحاظ سے مفصل اور حقیقی تاثرات میں ڈوبی ہوئی ہے۔" (عتیق الرحمن عثمانی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، امابعد،

بزرگو! اور دوستو!

یہ اجتماع جو دو روز سے اس عظیم الشان اور تاریخی ہال میں ہو رہا ہے ہر حیثیت سے ایک مقدس اور یادگار اجتماع ہے، جس شخصیت کے تذکار اور جس کی یاد منانے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں وہ ایک عظیم و جلیل شخصیت تھی جس نے کسی ستایش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کے بغیر کم و بیش ۴۵ سال تک علم و مذہب، ادب و انشا اور ملک و ملّت کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔

آپ کو معلوم ہے حضرت سید صاحب سے میرا تعلق استاذی، شاگردی کا نہیں تھا، میں نے درس و تدریس کے ضابطے میں سید صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا تھا، ایک شاگرد اپنے استاذ اور ایک مرید اپنے مرشد کی تعریف اور مدحت سرائی میں کبھی کبھی بے ارادہ بھی مبالغے سے کام لینے لگتا ہے اور اس کے بیان کے انداز اور لب و لہجے میں غُلو کا شائبہ آسکتا ہے لیکن مرحوم سے میرا علاقہ اس طرح کی تمام مقدس اور رسمی حد بندیوں سے آزاد رہا ہے، بنابریں میں جو

کچھ عرض کروں گا قدرتی طور پر اس کا وزن زیادہ ہوگا اور اس میں حقیقت کی زیادہ سے زیادہ صحیح ترجمانی ہوگی۔

مجھے یاد آتا ہے کہ حضرت سید صاحب سے میری پہلی باقاعدہ تفصیلی ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی اس سے پہلے عم محترم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بارہا ان کا ذکر سنا تھا لیکن قاعدے ضابطے کی یہ پہلی ملاقات تھی، یہ وہ وقت تھا کہ مرحوم وفد خلافت کے امیر کی حیثیت سے "دار العلوم دیوبند" میں تشریف لائے تھے اور میں "دار العلوم" سے فارغ ہی ہونے والا تھا، ۲۰-۱۹۲۱ء تحریک خلافت کے شباب کے سال تھے، ہم لوگوں نے ان دنوں "دار العلوم" میں "جمعیۃ الطلبہ" کے نام سے ایک نفیس اور زبردست تنظیم قایم کر رکھی تھی، یہ تنظیم ہمہ گیر تھی اور اس وقت اس کا نظام پورے ملک کے تقریباً تمام قابل ذکر عربی مدرسوں میں پھیلا ہوا تھا، جمعیۃ الطلبہ اپنے نظام کار اور وقتی مقاصد کی تبلیغ کے اعتبار سے ایک بہترین انجمن سمجھی جاتی تھی اور جہاں تک حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کے نقوشِ قدم کی پیروی کا تعلق تھا اس کی خدمات نہایت ہی روشن تھیں، یہی وجہ تھی کہ جب کبھی اس طرح کا کوئی موقر وفد ان دنوں "دار العلوم" میں آتا تھا، دار العلوم کے مہتمم صاحب "جمعیۃ" کی وقتی خدمات کو خاص طور اس کے سامنے سراہا کرتے تھے۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ اس موقع پر پہلی مرتبہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع ملا، موصوف سے میری یہ ملاقات جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ دار کی حیثیت سے ہوئی تھی، اس وقت پہلا جملہ جو سید صاحب کی زبان سے نکلا یہ تھا "ہدایہ کی زنجیروں میں کب تک بندھے رہو گے" پھر کچھ وقفے کے بعد فرمایا اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ "زمانہ" قدیم ہے تو تم اس کے خلاف اس کے حدوث پر کیا دلیل دو گے میں نے جواب میں قرآنِ مجید کی یہ آیت پڑھی هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا جسے سن کر سید صاحب خندۂ زیر لب سے مسکرا دیے، ۳۲ سال پہلے کی یہ ملاقات کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے اور لیل ونہار کی اس طویل گردش کے باوجود یہ واقعہ آج بھی ذہن ودماغ میں اسی طرح جما ہوا ہے۔

حضرت سید صاحب کی شکل وصورت، وضع، قطع، چال، ڈھال، لباس کی سادگی اور

صفائی، پُر دکار فروتنی اور انکسار و تواضع میں یوں بھی کچھ کم دل آویزی نہیں تھی، فی الحقیقت اُس وقت مجھ پر موصوف کی شخصیت کا غیر معمولی اثر پڑا حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ظاہری عقیدت اور نیازمندی کے جذبات کی مجھ میں ہمیشہ کمی رہی ہے اور یہ کمی سطحی نظر رکھنے والوں کو کبھی کبھی غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے یہاں تک کہ ان کو اس پر تمرّد کا گمان ہونے لگتا ہے، اس وقت سید صاحب کو قریب سے دیکھ کر مجھ پر جو اثر ہوا تقریب الی الفہم کے لئے اس کو اس روایت کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے جو مشہور اہل کتاب صحابی حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق وارد ہے، اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب وہ تورات کی پیشین گوئیوں کو منطبق کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو جیسے ہی ان کی نظر چہرۂ انور پر پڑی بے اختیار پکار اُٹھے "خدا کی قسم یہ چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا" یہ تشبیہ اور تمثیل کے طور پر نہیں محض بات کو قریب کرنے کے لئے عرض کر رہا ہوں، اس کے بعد موصوف کو کتنی ہی بار دیکھا اور کتنی ہی ملاقاتیں ہوئیں اور ہمیشہ ان کے انداز فکر اور شیوۂ متانت سے سبق لیتا رہا آخری ملاقات ابھی گذشتہ مئی ۱۹۵۳ء کو دہلی ہی میں ہوئی تھی جب مرحوم "ندوۃ المصنفین" کے دفتر میں تشریف لائے اور بڑے تپاک سے معانقہ کیا، ہم لوگ باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ خاموش رہنا چاہتے ہیں، ان کے شگفتہ چہرے سے افسردگی و پژمردگی ٹپک رہی تھی،

دوستو! سید صاحب جس وقت اُفقِ علم پر اُبھرے اس وقت علماء عام طور پر چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے، ان کے یہاں اہم اور غیر اہم کی کوئی تفریق نہیں رہی تھی، معمولی معمولی مسئلوں پر ہنگامے برپا ہو رہے تھے یہاں تک کہ نماز میں آمین زور سے پڑھنے یا آہستہ پڑھنے کے مُقدمات ابتدائی عدالتوں اور ہائی کورٹوں میں چل رہے تھے اور انگریز جج مسلمان عالموں سے دریافت کرتے تھے "ہم کو چار اماموں کی بات سمجھایئے" حالانکہ سب جانتے ہیں کہ آمین آہستہ پڑھنے یا زور سے پڑھنے کا تعلق جواز و عدم جواز سے نہیں صرف استحباب سے ہے، اسی کے ساتھ کافر گری کی مشین کی رفتار بھی کچھ کم تیز نہیں تھی۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکلا کہ بڑے بڑے اہل علم کی صلاحیتیں اس طرح کی

مجادلانہ اور مناظرانہ کج بحثیوں اور تنگ نظریوں میں ضائع ہونے لگیں اور ہر طرف افتراقِ اُمت کے مظاہر دیکھے جانے لگے،

سید صاحب محترم اُن اربابِ عزیمت و بصیرت علما میں ایک ممتاز ترین عالم دین تھے جنہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے ایک وسیع اور بلند معیار قایم کیا اور ایک حاذق طبیب کی طرح ملتِ گم گشتہ نبض پر ہات رکھا، ان کی تصنیفی اور علمی زندگی کے پورے چالیس سال کا وسعت قلب اور احتیاط سے جائزہ لیا جائے تو ہر مرحلے پر آپ کو اس کی شہادت ملے گی اور یہ ماننا پڑے گا کہ اس شہیدِ علم نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بہترین مصرف میں صرف کیا اور قوم و ملت کا دامن صالح و سنجیدہ لٹریچر سے مالا مال کر دیا، مستشرقینِ یورپ نے ریسرچ ورک کے نام سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے مشن اور آپ کی ذاتِ گرامی پر جو خوفناک حملے کئے ہیں اور آئے دن کرتے رہتے ہیں اُن کا مقابلہ علم و تحقیق کے اسی رنگ اور اُسی انداز میں جس طرح سید صاحب مرحوم نے کیا وہ اپنی مثال آپ ہے اس مرحلے پر سب سے اہم اور لایقِ ذکر بات یہ ہے کہ مرحوم نے اس مسلسل زبردست علمی اور تحقیقی جنگ میں تعلیماتِ اسلامی کی حقیقی روح کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس کو علم و بصیرت کی تمام رعنائیوں کے ساتھ اجاگر کرتے رہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر سید صاحب نہ صرف اپنے ہم عصروں اور عام مسلمان مورخوں سے ممتاز نظر آتے ہیں بلکہ اپنے شہرۂ آفاق اوستاذ مولانا شبلی مرحوم سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں، سچ تو یہ ہے اس مختصر فرصت میں مرحوم کی زندگی کے اس گوشے پر اُچٹتی ہوئی نظر ڈالنا بھی دشوار ہے۔ باقی

العلم والعلماء

یہ بہت بڑے امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت نفیس ترجمہ ہے کتاب کے مترجم مشہور ادیب اور بے مثال مترجم عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ہیں یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا گیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔

علم و فضیلتِ علم و علما پر اس درجے کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی، صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہت عمدہ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے،